ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1953

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: علوم القرآن (1) (1953) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن و تفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ: 1 تا 5)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(برائے مطالعہ و حوالہ)

نوٹ: یہ رہنما صرف مطالعے اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کریں اور جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

اسماءِ قرآن کریم اور اجزاءِ قرآن کے بارے میں نوٹ تحریر کریں۔

تعارف

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری اور محفوظ کتاب ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تیئس برس کے عرصے میں بتدریج نازل ہوئی۔ اس کتاب کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خود قرآن کریم کے اندر اس کے متعدد نام ذکر ہوئے ہیں، اور ہر نام اس کی کسی نہ کسی خصوصیت اور صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح مطالعے، حفظ اور تلاوت کی سہولت کے لیے قرآن کریم کو مختلف حصوں اور اجزاء میں تقسیم

کیا گیا ہے، مثلاً سورتیں، آیات، رکوع، پارے اور منازل وغیرہ۔ اس سوال میں پہلے قرآن کریم کے اسماء کا تعارف پیش کیا جائے گا اور پھر اس کے اجزاء اور تقسیمات کا جائزہ لیا جائے گا، تاکہ طالب علم کو معلوم ہو سکے کہ یہ نام اور یہ تقسیمات محض اتفاقی نہیں بلکہ قرآن فہمی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قرآن کے نام خود اس کے اپنے بیان کردہ ہیں، یعنی یہ نام اللہ تعالیٰ نے خود رکھے ہیں، جبکہ بعض نام ایسے بھی ہیں جو دراصل اس کی صفات ہیں مگر کثرت استعمال کی وجہ سے ناموں کی طرح مشہور ہو گئے۔ علماء نے اس موضوع پر مستقل تصانیف لکھی ہیں، اور امام سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں اس مسئلے پر مکمل بحث کی ہے۔ اسی طرح جزاء کی تقسیم کا مقصد تلاوت کی ترتیب، حفظ کی آسانی اور تدبر کی سہولت ہے، اور یہ تقسیمات توقیفی اور اجتہادی دونوں پہلو رکھتی ہیں۔

لفظِ قرآن کا مفہوم اور اشتقاق

لفظ قرآن کے اشتقاق میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ ق ر أ کے مادے سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں پڑھنا، یعنی یہ وہ کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے، اور فی الحقیقت دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن ہی ہے۔ دوسرے قول کے مطابق یہ قرن سے مشتق ہے جس کے معنی ملانا اور جمع کرنا ہے، کیونکہ قرآن نے تمام آسمانی ہدایات اور سابقہ شریعتوں کے اصول کو اپنے

اندر سمیٹ لیا ہے۔ بعض علماء اسے غیر مشتق اور علم (خاص نام) قرار دیتے ہیں، جیسے تورات اور انجیل اپنے اپنے پیغمبروں کی کتابوں کے خاص نام ہیں۔

اصطلاحاً قرآن سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عربی زبان میں نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا، تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا، اور جس کی تلاوت عبادت ہے۔ خود قرآن نے اپنے تعارف میں فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں اور یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے (سورۃ البقرۃ: 2)۔ یہی بنیادی تعریف آگے بیان ہونے والے تمام ناموں کی جڑ ہے۔

قرآن کریم کے مشہور اسماء

قرآن کریم کے سب سے مشہور نام خود قرآن، الکتاب، الفرقان، الذکر اور التنزیل ہیں۔ قرآن نام کی شہرت اس قدر ہے کہ یہی اس کا علامتی نام بن گیا۔ الکتاب اس لیے کہا گیا کہ یہ لکھی ہوئی اور محفوظ کتاب ہے، اور سورۃ البقرۃ کی ابتداء میں ذلک الکتاب لاریب فیہ کہہ کر اسی نام سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ الفرقان کا مطلب ہے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا؛ سورۃ الفرقان کی پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔

الذکر اس کا چوتھا مشہور نام ہے، جس کی طرف سورۃ الحجر میں اشارہ ہے کہ بے شک ہم نے ہی ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں (سورۃ الحجر: 9)۔ ذکر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اللہ کی یاد بھی ہے اور نصیحت و موعظت بھی۔ التنزیل اس لیے کہا گیا کہ یہ آہستہ آہستہ نازل ہونے والا کلام ہے؛ سورۃ الشعراء میں ہے کہ بے شک یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے، اسے روح الامین لے کر اترے (سورۃ الشعراء: 192 تا 194)۔ ان پانچ ناموں کے علاوہ خود قرآن میں اس کے لیے کئی اوصاف اور صفاتی نام آئے ہیں جن کا بیان اگلے عنوان میں آتا ہے۔

قرآن کے صفاتی نام و اوصاف

قرآن کریم نے اپنی صفات کے طور پر متعدد اسماء و اوصاف استعمال کیے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس کے کسی کمال کی خبر دیتا ہے۔ اسے نور کہا گیا کہ یہ دلوں کی روشنی ہے (سورۃ النساء: 174)، شفاء کہا گیا کہ یہ سینوں کی بیماریوں کا علاج ہے (سورۃ یونس: 57)، ہدیٰ و رحمت کہا گیا، مبارک کہا گیا کہ یہ بابرکت کتاب ہے (سورۃ الانعام: 92)، مجید کہا گیا کہ یہ بڑی شان والا ہے (سورۃ ق: 21)، کریم کہا گیا کہ یہ عزت والا ہے (سورۃ الواقعۃ: 77)، حکیم کہا گیا کہ یہ حکمت سے بھرا ہوا ہے (سورۃ یٰس: 2)، عزیز کہا گیا کہ اس پر باطل نہ آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے (سورۃ فصلت: 41 تا 42)، اور علی و حکیم بھی فرمایا گیا (سورۃ الزخرف: 4)۔

علاوہ ازیں اسے بشیر و نذیر کا وصف دیا گیا، بیان للناس کہا گیا، موعظہ کہا گیا، فصل کہا گیا کہ یہ فیصلہ کن قول ہے، اور مثانی کہا گیا کہ اس کی آیات بار بار دہرائی جاتی ہیں (سورۃ الزمر: 23)۔ ابو العالی وغیرہ نے قرآن کے ناموں کی تعداد پچپن کے لگ بھگ گنائی ہے، جبکہ فیروز آبادی نے بصائر ذوی التمییز میں تقریباً سو کے قریب اسماء و اوصاف جمع کیے ہیں۔ ان ناموں کی کثرت دراصل قرآن کے کمالات کی کثرت کی دلیل ہے، کیونکہ عرب کا دستور تھا کہ کسی چیز کی اہمیت زیادہ ہو تو اس کے نام بھی زیادہ رکھے جاتے تھے، جیسے تلوار اور شیر کے بے شمار نام ہیں۔

جدول: اجزاءِ قرآن کا اجمالی خاکہ

جز / تقسیم	تعداد	مختصر تعارف
سورتیں	114	پہلی الفاتحہ، آخری الناس؛ ترتیب توقیفی
آیات	6236 (مشہور گنتی)	قرآن کی چھوٹی ترین اکائی؛ شمار میں اختلاف وقف و ابتدا کا ہے
رکوع	540 کے لگ بھگ	مربوط مضمون کا مجموعہ؛ علامت: ع
پارے (اجزاء)	30	تلاوت کی سہولت کے لیے برابر تقسیم
احزاب	60	ہر پارے کے دو حزب؛ ہر حزب کے چار ربع
منازل	7	ایک ہفتے میں ختم قرآن کی تقسیم

اجزاءِ قرآن: سورتیں اور آیات

قرآن کریم کا سب سے بڑا اجزا اس کی سورتیں ہیں۔ قرآن میں کل ایک سو چودہ (114) سورتیں ہیں، پہلی سورۃ الفاتحہ اور آخری سورۃ الناس۔ سورت سے مراد آیات کا وہ مجموعہ ہے جس کا آغاز و اختتام اور مستقل موضوع ہو۔ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق مقرر ہوئی۔ سورتوں کو طول و قصر کے لحاظ سے چار بڑی قسموں میں بانٹا گیا ہے: السبع الطوال یعنی سات لمبی سورتیں (البقرۃ سے التوبہ تک)، المئون جن کی آیات سو کے لگ بھگ یا اس سے زیادہ ہوں، المثانی جن کی آیات اس سے کم ہوں، اور المفصل جو سورۃ ق یا الحجرات سے آخر تک کا حصہ ہے اور فاصلے (بسملہ) کی کثرت کی وجہ سے مفصل کہلاتا ہے۔ اسی طرح نزول کے اعتبار سے سورتیں مکی اور مدنی کہلاتی ہیں۔

آیت قرآن کی سب سے چھوٹی اکائی ہے؛ آیت کے لغوی معنی نشانی اور علامت کے ہیں، کیونکہ ہر آیت اللہ کی قدرت اور اس کلام کے اعجاز کی نشانی ہے۔ آیات کی تعداد میں شمار کے اختلاف کی وجہ سے علماء کے اقوال مختلف ہیں؛ مشہور گنتی کے مطابق آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس (6236) ہے، جبکہ عامۃ الناس میں چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (6666) کی تعداد بھی مشہور ہے جو دراصل مختلف عدّ (شمار) کے طریقوں کا نتیجہ ہے؛ اس اختلاف سے متن قرآن میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ اختلاف آیات کے وقف و ابتدا کے شمار میں ہے، الفاظ میں نہیں۔

رکوع، پارے، منازل اور احزاب

رکوع آیات کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو ایک مربوط مضمون پر مشتمل ہو اور نماز میں ایک رکوع کے ساتھ پڑھنا مناسب سمجھا جائے۔ مصاحف میں رکوع کی علامت ع ہوا کرتی ہے اور ان کی مجموعی تعداد پانچ سو چالیس (540) کے لگ بھگ مشہور ہے، اگرچہ بعض مصاحف میں اس سے کم و بیش تعداد ملتی ہے کیونکہ رکوع کی تقسیم اجتہادی ہے۔ اس تقسیم کا مقصد نماز اور تراویح میں تلاوت کی آسانی اور مضمون کی تکمیل کا لحاظ ہے، تاکہ رکوع ایسے مقام پر ہو جہاں بات مکمل ہو جائے۔

تلاوت کی سہولت کے لیے پورے قرآن کو تیس برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں سے ہر حصے کو جز یا پارہ کہتے ہیں۔ ہر پارے کو دو حزبوں میں اور ہر حزب کو چار ربعوں میں بانٹا گیا ہے، اس طرح پورے قرآن میں ساٹھ احزاب بنتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص ایک ہفتے میں قرآن ختم کرنا چاہے اس کے لیے سات منازل مقرر کی گئی ہیں؛ صحابہ کرام میں ایک ہفتے میں ختم قرآن کا معمول مشہور تھا، اور حدیث میں تین دن سے کم میں ختم کرنے کی ممانعت اور ہفتے کی مدت کی رہنمائی موجود ہے۔ اس کے علاوہ اعشار و اخماس کی تقسیمات بھی مصاحف کی زینت رہی ہیں، یعنی ہر پانچ یا دس آیات پر نشان لگایا جاتا تھا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے اسماء، خواہ وہ اس کے ذاتی نام ہوں جیسے قرآن، کتاب، فرقان، ذکر اور تنزیل، یا صفاتی نام ہوں جیسے نور، شفاء، ہدیٰ اور مجید، سب اس کی عظمت، اس کے مناصب اور اس کے فوائد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی طرح اس کے اجزاء یعنی سورتیں، آیات، رکوع، پارے، منازل اور احزاب کی تقسیم نے حفظ، تلاوت اور تدبر کو آسان بنا دیا ہے۔ ان اسماء و اجزاء کا علم علوم القرآن کی بنیاد ہے، کیونکہ جب تک طالب علم کتاب کے ناموں کی معنویت اور اس کی تنظیم سے واقف نہ ہو، وہ اس کے گہرے مطالعے کی طرف درست سمت میں قدم نہیں بڑھا سکتا۔

سوال نمبر 2 (20 نمبر)

وحی سے کیا مراد ہے؟ وحی پر کئے گئے اعتراضات کا مدلل جواب تحریر کریں۔

تعارف

وحی اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے، کیونکہ قرآن کریم کا نزول اسی وحی کے ذریعے ہوا اور نبوت و رسالت کی پوری عمارت اسی پر کھڑی ہے۔ اگر وحی کا مفہوم اور اس کی حقیقت واضح نہ ہو تو نہ قرآن کی حجیت ثابت ہوتی ہے اور نہ نبوت کا دعویٰ سمجھ میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم القرآن کی کتابوں کا آغاز عموماً وحی کی بحث سے ہوتا ہے۔ اس جواب میں پہلے وحی کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بیان کیا جائے گا، پھر اس کی اقسام و کیفیات کا ذکر ہوگا، اور اس کے بعد وحی پر کیے جانے والے مشہور اعتراضات کا مدلل و مفصل جواب دیا جائے گا۔

وحی کا مسئلہ قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔ قدیم دور میں مکہ کے مشرکین نے وحی پر اعتراضات کیے، قرآن نے خود ان کا جواب دیا۔ جدید دور میں مستشرقین اور ملحدین نے نفسیات اور تاریخ کے نام پر نئی صورتوں میں وہی پرانے اعتراضات دہرائے ہیں۔ اس لیے اس بحث کا مطالعہ طالب علم کے لیے دوہرا فائدہ رکھتا ہے: ایک طرف ایمان مضبوط ہوتا ہے اور دوسری طرف منکرین کے شبہات کا علمی رد میسر آتا ہے۔

وحی کا لغوی مفہوم

وحی کا مادہ وح ی ہے۔ اہل لغت کے نزدیک وحی کے کئی معانی ہیں: تیز اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام بھیجنا، دل میں بات ڈالنا (الہام)، اور خفیہ طریقے سے بات کرنا۔ راغب اصفہانی کے مطابق وحی اصل میں تیز اشارے کو کہتے ہیں، اور چونکہ الہامی کلام تیزی اور خفیہ پن کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے اسے وحی کہا جانے لگا۔ قرآن کریم نے یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے: شہد کی مکھی کی طرف وحی سے مراد فطری الہام ہے (سورۃ النحل: 68)، حضرت مریم کی والدہ یا حضرت موسیٰ کی والدہ کے بارے میں وحی سے مراد دل میں بات ڈالنا ہے (سورۃ القصص: 7)، شیاطین کی وحی سے مراد وسوسہ ہے (سورۃ الانعام: 112)، اور آسمانوں کی وحی سے مراد حکم و تقدیر ہے (سورۃ فصلت: 12)۔

ان تمام استعمالات میں قدر مشترک تیز اور خفیہ اطلاع ہے۔ پیغمبر کی طرف ہونے والی وحی میں یہ دونوں عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں: یہ کلام فوراً اور یقینی طور پر دل میں اترتا ہے اور عام انسانوں کے مشاہدے سے پوشیدہ رہتا ہے۔ لغوی مفہوم سمجھنے سے اصطلاحی تعریف کی بنیاد بن جاتی ہے۔

وحی کی اصطلاحی تعریف اور اقسام

اصطلاحِ شریعت میں وحی سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ کلام و ہدایت ہے جو وہ اپنے منتخب بندوں یعنی انبیاء علیہم السلام تک کسی خاص طریقے سے پہنچاتا ہے تاکہ وہ اسے انسانوں تک پہنچائیں۔ امام زرکشی اور دیگر علماء کی تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ وحی اللہ کا اپنے نبی کو شریعت اور غیب کی خبریں اس یقینی اور غیر معمولی ذریعے سے پہنچانا ہے جو عام انسانی ذرائع علم سے الگ ہو۔ اس تعریف سے وحی کی تین خصوصیتیں واضح ہوتی ہیں: اس کا ماخذ اللہ ہے، اس کا محل نبی کا قلب ہے، اور اس کا نتیجہ قطعی و یقینی علم ہے جس میں شک و خطا کی گنجائش نہیں۔

قرآن کریم نے سورۃ الشوریٰ میں وحی کی تین صورتیں بیان فرمائی ہیں: کسی انسان کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی فرشتہ بھیجے جو اس کے حکم سے جو چاہے وحی کرے (سورۃ الشوریٰ: 51)۔ پہلی صورت قلب میں براہِ راست القا ہے، دوسری وہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوئی، اور تیسری حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے پہنچنے والی وحی ہے جو قرآن کے نزول کا عام ذریعہ رہی۔ اسی طرح علماء وحی کو متلو اور غیر متلو میں بھی تقسیم کرتے ہیں: وحی متلو قرآن ہے جس کی تلاوت عبادت ہے، اور وحی غیر متلو سنت و حدیث قدسی ہے جس کے مفہوم الہامی ہیں۔

وحی کی کیفیتیں اور آغازِ نزول

صحیح بخاری کی مشہور حدیث میں حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کے سوال پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی دو بڑی کیفیتیں بیان فرمائیں: کبھی وحی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی اور یہ کیفیت آپ پر سب سے زیادہ سخت ہوتی، جب کیفیت ختم ہوتی تو آپ نے فرشتے کی کہی ہوئی بات یاد کر لی ہوتی؛ اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں آ کر بات کرتا جو سننے والوں کے سامنے بھی واقع ہوتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ سخت سردی کے دن بھی وحی کی حالت ختم ہونے پر آپ کی پیشانی سے پسینہ ٹپکتا تھا، اور آپ کا جسم مبارک ثقیل ہو جاتا تھا، حتیٰ کہ اگر آپ اونٹنی پر سوار ہوتے تو وہ بیٹھ جاتی۔ یہ علامات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ وحی نبی کی اپنی نفسی کیفیت نہیں تھی بلکہ باہر سے آنے والا ایک غیر معمولی بوجھ تھا۔

نزول وحی کا آغاز غار حرا میں ہوا جب آپ تنہائی میں عبادت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آ کر اقرأ کہا اور سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ اس واقعے کے بعد ایک مدت وحی رکی رہی جسے فترت الوحی کہتے ہیں، پھر سورۃ المدثر کے نزول سے وحی کا تسلسل جاری ہوا جو تیئس برس تک رہا۔ آغاز وحی سے پہلے آپ کو سچے خواب دکھائے جاتے تھے جو صبح کی روشنی کی طرح پورے ہوتے، جسے علماء وحی کی تمہیدی صورت قرار دیتے ہیں۔

وحی پر اعتراضات اور ان کے جوابات: نفسیاتی توجیہہ کا رد

پہلا بڑا اعتراض یہ ہے کہ وحی محض نبی کی اپنی نفسی کیفیت، باطنی الہام یا بعض کے بقول اعصابی بیماری کا نتیجہ تھی۔ یہ اعتراض مدلل طور پر باطل ہے۔ اولاً، وحی کا مواد نبی کی اپنی معلومات سے کہیں بلند تھا: امی ہونے کے باوجود آپ نے گزشتہ امتوں کے واقعات، کونیاتی حقائق اور مستقبل کی خبریں بیان کیں جو انسانی نفس کی خود ساختہ پرواز سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ثانیاً، وحی آپ کے اختیار میں نہیں تھی؛ کئی مواقع پر وحی دیر سے آئی اور آپ انتظار کرتے رہے، جیسے واقعہ افک میں ایک ماہ تک وحی نہ آئی اور آپ پریشان رہے۔ اگر وحی آپ کی اپنی کیفیت ہوتی تو ضرورت کے وقت وہ خود پیدا کر لی جاتی۔

ثالثاً، قرآن میں بعض آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کی گئی، جیسے سورۃ عبس کا آغاز اور بعض اجتہادی امور پر عتاب۔ انسان اپنی تصنیف میں خود کو اس طرح مخاطب نہیں کرتا۔ رابعاً، وحی کی ظاہری علامات (ثقل، پسینہ، گھنٹی کی آواز) صحابہ نے مشاہدہ کیں، جو داخلی کیفیت کی نہیں بلکہ خارجی واقعے کی گواہی ہیں۔ خامساً، جو شخص بیماری یا وہم کا شکار ہو اس کی تعلیمات سے ایک مکمل تہذیب، قانون اور امت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ قرآن کی متوازن اور ہمہ گیر نظام زندگی اس اعتراض کی عملی تردید ہے۔

اعتراض: قرآن انسانی تصنیف یا ماخوذ کلام ہے

دوسرا اعتراض یہ تھا اور ہے کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف ہے یا یہ تورات و انجیل اور عرب کے قصص سے ماخوذ ہے۔ قرآن نے خود اس اعتراض کا جواب دیا اور چیلنج (تحدی) پیش کیا کہ اگر تم شک میں ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ (سورۃ البقرۃ: 23)۔ چودہ سو

سال سے یہ چیلنج قائم ہے اور عرب کے فصحاء و بلغاء، جن کی زبان و ادب پر ناز تھا، اس کا جواب دینے سے قاصر رہے، حالانکہ ان کے پاس ہر محرک موجود تھا۔ فصاحت کے امام ولید بن مغیرہ نے مجبوراً کہا کہ اس کلام میں ایک خاص حلاوت ہے اور یہ انسانی کلام جیسا نہیں۔

ماخوذ ہونے کا الزام بھی درست نہیں۔ آپ امی تھے، پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، مکہ میں تورات و انجیل کے نسخے عربی میں دستیاب ہی نہ تھے، اور جن واقعات کا ذکر قرآن میں ہے ان میں سابقہ کتابوں کی تحریفات کی تصحیح کی گئی ہے اور کئی جزئیات ان سے مختلف ہیں، جو نقل کرنے والے کا کام نہیں ہوتا۔ قرآن نے خود فرمایا کہ آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، ورنہ باطل پرست جھگڑا کرتے (سورۃ العنکبوت: 48)۔ مزید یہ کہ وحی کے نزول کا وقت، موضوع اکثر آپ کی مرضی کے خلاف یا فوری ضرورت کے جواب میں ہوتا تھا، جو تصنیف کے مزاج کے برعکس ہے۔

اعتراض: شاعری، کہانت اور اساطیر کا الزام

مشرکین مکہ نے کبھی آپ کو شاعر کہا، کبھی کاہن، کبھی ساحر، اور قرآن کو اساطیر الاولین یعنی اگلوں کے قصے کہا۔ ان الزامات کی باہمی تضاد ہی ان کے جھوٹ کی دلیل ہے، کیونکہ ایک ہی کلام بیک وقت شاعری بھی ہو اور کہانت بھی نہیں ہو سکتا، اور نہ ایک امی شخص اساطیر کا مرتب ہو سکتا ہے جن کا سراغ خود عرب کے علماء کے پاس بھی موجود نہ تھا۔ قرآن خود فرماتا ہے کہ ہم نے اسے شاعری نہیں سکھائی اور نہ یہ

اس کے لائق ہے، یہ تو نصیحت اور روشن قرآن ہے (سورۃ یٰس: 69)۔ شاعری کا ایک مخصوص وزن و قافیہ ہوتا ہے اور شاعر کا کلام اس کے ذاتی جذبات کا آئینہ ہوتا ہے، جبکہ قرآن کا اسلوب، اس کے احکام اور اس کا عالمگیر پیغام شاعری کی دنیا سے بالکل الگ ہے۔

کہانت کا الزام اس لیے باطل ہے کہ کاہن مبہم اور چھپے ہوئے جملے بولتے اور غلطیاں کرتے تھے، جبکہ وحی کا کلام واضح، مدلل اور صادق الاخبار تھا۔ جہاں تک اساطیر کہنے کی بات ہے تو قصص قرآنی عبرت و نصیحت کے لیے ہیں اور قرآن نے ان واقعات کو تاریخی صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ جدید آثار قدیمہ کی تحقیقات نے کئی قرآنی بیانات کی تصدیق کی ہے۔ یوں ان تمام الزامات کا جواب خود قرآن کی زبان اور اس کے اثرات میں پوشیدہ ہے۔

وحی کے عقلی امکان پر اعتراض کا جواب

ایک فلسفیانہ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وحی عقل کے خلاف ہے کیونکہ انسان صرف حواس و عقل سے علم حاصل کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وحی عقل کے خلاف نہیں بلکہ عقل سے ماورا ہے، اور دونوں میں فرق ہے۔ عقل خود اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ علم کے ذرائع محدود نہیں؛ انسان خواب میں، الہام میں اور وجدان میں ایسے امور جانتا ہے جو حواس سے حاصل نہیں ہوتے۔ اللہ کی قدرت کے لیے یہ کوئی محال نہیں کہ وہ اپنے منتخب بندے کے قلب کو اپنی ہدایت کا محل بنالے، جس طرح اس نے انسانی عقل کو ایجادات کی صلاحیت دی ہے۔

مزید یہ کہ عقل وحی کی ضرورت کو بھی ثابت کرتی ہے: انسانی عقل موت کے بعد کی زندگی، عبادات کی تفصیلات اور اخلاق کے آخری معیارات جیسے امور میں حتمی رہنمائی نہیں دے سکتی؛ اختلاف عقول کی صورت میں ایک مافوق العقل ہدایت ناگزیر ہے۔ لہٰذا وحی عقل کی تنقیص نہیں بلکہ اس کی تکمیل ہے، جیسے روشنی آنکھ کی تنقیص نہیں بلکہ اس کی مددگار ہے۔ یہی ابن تیمیہ و دیگر علماء کی بحث کا خلاصہ ہے کہ صحیح نقل اور صریح عقل میں کبھی تعارض نہیں ہوتا۔

نتیجہ

نتیجہ یہ نکلا کہ وحی اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء تک ہدایت پہنچانے کا یقینی اور غیر معمولی ذریعہ ہے، جس کی حقیقت لغت، قرآن اور احادیث سے ثابت ہے۔ وحی پر کیے گئے اعتراضات، چاہے وہ نفسیاتی توجیہہ کی صورت میں ہوں یا تصنیف و اخذ کے الزام میں یا شاعری و کہانت کی نسبت میں، سب کے مدلل جوابات موجود ہیں اور خود قرآن کا اعجاز، اس کی محفوظیت اور اس کے ہمہ گیر اثرات ان اعتراضات کی سب سے بڑی عملی تردید ہیں۔ طالب علم کے لیے اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ وحی پر ایمان ہی قرآن کی حجیت کی بنیاد ہے، اور اس بنیاد کے مضبوط ہونے سے پورا دینی نظام استوار ہوتا ہے۔

سوال نمبر 3 (20 نمبر)

علوم القرآن کے آغاز و ارتقاء پر ایک جامع نوٹ تحریر کریں۔

تعارف

علوم القرآن سے مراد علم و فنون کا وہ مجموعہ ہے جو قرآن کریم کے نزول، جمع و تدوین، قراءت، تفسیر، اعجاز، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور دیگر متعلقات کی بحث کرتا ہے۔ یہ علوم کسی ایک دن میں وجود میں نہیں آئے بلکہ صدیوں کے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہیں، اور ان کی تاریخ خود اسلام کی علمی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اس نوٹ میں علوم القرآن کے آغاز، مختلف ادوار میں اس کی ترقی، اور اہم تصانیف کا جامع جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اس ارتقاء کو سمجھنے کے لیے اسے بڑے ادوار میں تقسیم کرنا مفید ہے: عہد نبوی جس میں ان علوم کے بیج بوئے گئے، عہد صحابہ و تابعین جس میں بنیادیں مضبوط ہوئیں، دور تدوین جس میں یہ علوم مستقل تصانیف کی صورت میں ڈھلنے لگے، دور تخصص جس میں ہر فن پر الگ کتابیں لکھی گئیں، اور جدید دور جس میں یہ فن جامع انسائیکلوپیڈیائی تصانیف تک پہنچا۔ یہی ترتیب اس نوٹ کی بنیاد ہے۔

عہد نبوی: علوم القرآن کا بیج

علوم القرآن کا نقطہ آغاز خود عہد نبوی ہے۔ نزول قرآن کے ساتھ ہی کتابت وحی کا سلسلہ شروع ہوا؛ کاتبین وحی نازل شدہ آیات کو لکھ لیتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود آیات کی جگہ اور سورتوں کی ترتیب کی رہنمائی فرماتے۔ جب کوئی آیت سمجھنے میں مشکل پیش آتی تو صحابہ آپ سے سوال کرتے اور آپ تفسیر فرما دیتے، مثلاً سورۃ الانعام کی آیت میں ظلم کی تفسیر شرک سے کرنا اور سورۃ البقرۃ میں سفید و کالے

دھاگے کی وضاحت اسی کی مثالیں ہیں۔ اسی عہد میں اسباب نزول کا علم بھی عملی طور پر موجود تھا، کیونکہ صحابہ ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے جن کے پس منظر میں آیات نازل ہوئیں۔

قراءت و حفظ کا نظام بھی اسی دور سے شروع ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان حضرت جبریل علیہ السلام کے سامنے قرآن کا دور فرماتے اور آخری سال یہ عرضہ دو مرتبہ ہوا۔ مسجد نبوی میں اصحاب صفہ کی تعلیم، مختلف قبائل کی طرف اساتذہ کی روانگی اور قاریوں کی شہرت اسی دور کی دین ہے۔ گویا تفسیر، اسباب نزول، قراءت، کتابت اور حفظ جیسے بنیادی علوم کی عملی صورتیں عہد نبوی میں قائم ہو چکی تھیں، اگرچہ اس وقت یہ الگ الگ فنون کے ناموں سے موسوم نہ تھے۔

عہد صحابہ و تابعین: بنیادوں کا استحکام

عہد صحابہ میں علوم القرآن نے فیصلہ کن منزلیں طے کیں۔ جنگ یمامہ میں حفاظ کی بڑی تعداد کی شہادت کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن کو پہلی مرتبہ ایک مصحف میں جمع کیا گیا، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ عظیم کام انتہائی احتیاط سے انجام دیا۔ پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں قراءت کے اختلافات کے پیش نظر امت کو ایک رسم اور ایک مصحف پر جمع کیا گیا جسے مصحف امام کہا جاتا ہے۔ یہ دو واقعات علم جمع القرآن کی بنیاد بنے۔ اسی دور میں بڑے مفسر صحابہ مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، جنہیں ترجمان القرآن کہا جاتا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما نے تفسیر کی روایات کو آگے بڑھایا۔

تابعین کے دور میں ان علوم کی وسعت پیدا ہوئی۔ حضرت مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر اور حسن بصری رحمہم اللہ نے تفسیر کی باقاعدہ مجلسیں قائم کیں۔ اسی زمانے میں مصحف پر نقطے اور اعراب لگانے کا کام شروع ہوا تاکہ عجمی مسلمان قراءت میں غلطی نہ کریں؛ ابوالاسود دئلی نے اعراب کی بنیاد رکھی اور نصر بن عاصم و یحییٰ بن یعمر نے حروف پر نقطوں کا نظام وضع کیا، بعد میں خلیل بن احمد فراہیدی نے موجودہ علامات کو تکمیل دی۔ یہ کوششیں دراصل علم قراءت اور علم رسم المصحف کی ابتدائی صورتیں تھیں۔

دور تدوین: مستقل تصانیف کی ابتداء

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں تدوین علم کا سنہری دور آیا اور قرآنی علوم بھی مستقل کتابوں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ اسباب نزول میں علی بن مدینی وغیرہ کی کوششوں کے بعد امام واحدی کی اسباب النزول اس فن کی مشہور ترین کتاب بنی۔ ناسخ و منسوخ پر ابو عبید قاسم بن سلام کی کتاب الناسخ والمنسوخ اور مکی بن ابی طالب کی الایضاح اہم سنگ میل ہیں۔ غریب القرآن یعنی مشکل الفاظ کی تشریح کے فن میں ابن قتیبہ کی تفسیر غریب القرآن معروف ہے۔ قراءتوں پر ابن مجاہد کی کتاب السبعہ نے سبعہ قراءت کو منظم کیا اور امام شاطبی کی منظوم حرز الامانی نے اس فن کو دنیا بھر میں پھیلا دیا۔

تفسیر کے میدان میں ابن جریر طبری کی جامع البیان نے روایتی تفسیر کو عروج پر پہنچایا اور اسی دور میں تفسیر بالمأثور کی روایت مضبوط ہوئی۔ ان تصانیف کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر کتاب کسی ایک خاص فن پر مرکوز ہوتی تھی، یعنی تخصص کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ یہی رجحان آگے چل

کر جامع موسوعات کی راہ ہموار کرتا ہے، کیونکہ جب الگ الگ فنون پر مواد جمع ہو جائے تو اسے ایک جگہ یکجا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

کلاسیکی عروج: البرہان اور الاتقان

علوم القرآن کے ارتقاء کی چوٹی امام بدرالدین زرکشی کی البرہان فی علوم القرآن (وفات 794ھ) اور امام جلال الدین سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن (وفات 911ھ) ہیں۔ زرکشی نے پہلی مرتبہ ان علوم کو ایک جامع کتاب میں سینتالیس ابواب (اقسام) کی صورت میں مرتب کیا اور ہر قسم پر مستقل بحث کی۔ سیوطی نے الاتقان میں ان اقسام کو اسی (80) تک پہنچایا اور ہر عنوان پر روایات، اقوال علماء اور مثالیں جمع کر دیں۔ الاتقان آج تک اس فن کی سب سے مستند اور جامع مراجع کتاب سمجھی جاتی ہے اور ہر بعد کا مصنف اسی کا حوالہ دیتا ہے۔

اس دور میں ابن تیمیہ کے مقدمہ فی اصول التفسیر نے تفسیر کے اصولوں کو علمی بنیاد دی اور ابن جزری کی النشر فی قراءات العشر نے قراءتوں کے فن کو کمال تک پہنچایا۔ اعجاز القرآن پر عبدالقاہر جرجانی کی دلائل الاعجاز نے نظریہ نظم کے ذریعے بلاغت کی نئی بنیاد رکھی۔ ان تصانیف سے علوم القرآن ایک باقاعدہ اور مدون فن کی صورت اختیار کر چکا تھا جس کے اپنے اصطلاحات، اصول اور مراجع تھے۔

جدید دور اور برصغیر کی خدمات

جدید دور میں علوم القرآن پر جامع اور سہل اسلوب میں لکھی گئی کتابوں نے اس فن کو عام طالب علم تک پہنچایا۔ مصر کے شیخ محمد عبد العظیم زرقانی کی مناہل العرفان فی علوم القرآن اور صبحی صالح کی مباحث فی علوم القرآن نہایت مقبول ہوئیں، جبکہ مناع القطان کی مباحث فی علوم القرآن نصابی اعتبار سے دنیا بھر کے مدارس و جامعات میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان کتابوں میں قدیم مواد کو نئے سوالات، مستشرقین کے شبہات کے جوابات اور جدید تحقیق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند نے بھی اس میدان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر اصول تفسیر پر مختصر مگر جامع رسالہ ہے، اور حمید الدین فراہی نے نظم قرآن کے علم کو نئی بلندی دی جسے ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں عملاً برت کر دکھایا۔ اردو زبان میں علوم القرآن پر بڑی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں جنہوں نے اردو داں طلبہ کے لیے یہ فن آسان بنا دیا۔ یوں یہ علوم عرب سے شروع ہو کر پوری دنیا میں پھیل گئے اور ہر دور میں ان کی تدوین نو ہوتی رہی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ علوم القرآن کا سفر عہد نبوی کے عملی بیج سے شروع ہو کر صحابہ کے دور میں جمع و حفاظت کی منزل سے گزرا، عباسی دور میں تدوین و تخصص حاصل کیا، زرکشی و سیوطی کے ہاتھوں جامع موسوعات کی صورت اختیار کی، اور جدید دور میں عالمی سطح پر نصاب و تحقیق کا

موضوع بن گیا۔ یہ ارتقاء اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کے ساتھ امت کا علمی تعلق ہر دور زندہ رہا ہے۔ طالب علم کے لیے لازم ہے کہ وہ الاتقان و مناہل العرفان جیسی بنیادی کتب سے ان علوم کی تعریفات و اصطلاحات ضرور مستحضر رکھے۔

سوال نمبر 4 (20 نمبر)

جملہ قرآنی علوم پر ایک اجمالی تعارف تحریر کریں۔

تعارف

قرآن کریم کے مطالعے سے جو علوم و فنون پیدا ہوئے انہیں مجموعی طور پر علوم القرآن کہا جاتا ہے۔ امام سیوطی نے الاتقان میں ان علوم کی اسی (80) کے لگ بھگ اقسام گنوائی ہیں، اور ابن العربی سے منقول ہے کہ قرآن سے متعلق علوم کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے کیونکہ ہر آیت کے ظاہر، باطن، حد اور مطلع کو الگ علم شمار کیا جائے تو تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس سوال میں جملہ قرآنی علوم کے ایک اجمالی تعارف کے طور پر اہم ترین علوم کا مختصر بیان پیش کیا جا رہا ہے تاکہ طالب علم کو پوری تصویر ایک نظر میں مل سکے۔

ان علوم کو دو بڑی خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے: ایک وہ علوم جو قرآن کے متن، اس کی تاریخ اور اس کی قراءت سے متعلق ہیں، جیسے علم نزول، علم جمع و تدوین اور علم قراءات؛ اور دوسرے وہ علوم جو قرآن کے معانی و مفاہیم اور اس کے اصول فہم سے متعلق ہیں، جیسے تفسیر، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، عام و خاص اور اعجاز۔ ذیل میں دونوں اقسام کے نمایاں علوم کا تعارف دیا جاتا ہے۔

علم نزول، مکی و مدنی اور اسباب نزول

علم نزول سے مراد قرآن کے اترنے کی کیفیت، اس کی مدت، اس کی تدریج اور پہلی و آخری نازل شدہ آیات کی معرفت ہے۔ اسی سے جڑا ہوا علم مکی و مدنی ہے جس میں سورتوں اور آیات کو ہجرت سے پہلے اور بعد کے نزول کے لحاظ سے پہچانا جاتا ہے؛ مکی سورتوں میں عموماً توحید، رسالت اور آخرت کے مضامین اور مدنی سورتوں میں احکام و معاشرت کے مسائل ہوتے ہیں۔ عالم دین کے لیے یہ پہچان اس لیے ضروری ہے کہ احکام کی ترتیب، خطاب کا مخاطب اور اسلوب کی تبدیلی اسی سے سمجھ میں آتی ہے۔

اسباب نزول اس علم کو کہتے ہیں جس میں ان واقعات و سوالات کی معرفت حاصل کی جاتی ہے جن کے پس منظر میں کوئی آیت نازل ہوئی۔ سبب نزول معلوم ہونے سے آیت کا مفہوم واضح ہوتا ہے، حکم کی حکمت ظاہر ہوتی ہے اور کئی مقامات پر اجمال دور ہو جاتا ہے۔ امام واحدی کا قول مشہور ہے کہ جس آیت کا سبب نزول معلوم نہ ہو اس کی تفسیر میں قدم رکھنا درست نہیں۔ اس فن کی سب سے مشہور کتاب امام واحدی کی اسباب النزول ہے اور سیوطی کی لباب النقول اسی کی تکمیل ہے۔

علم جمع و تدوین، رسم اور قراءات

علم جمع القرآن میں اس تاریخ کی بحث ہوتی ہے کہ قرآن عہد نبوی میں کس طرح لکھا گیا، عہد صدیقی میں کس طرح ایک مصحف میں جمع ہوا اور عہد عثمانی میں کس طرح سرکاری نسخے تیار کر کے عالم اسلام میں بھیجے گئے۔ اس سے جڑا علم رسم المصحف ہے جس میں مصحف عثمانی کے

خاص املاء ورسم الخط کے قواعد کی بحث آتی ہے، کیونکہ اس رسم میں بعض الفاظ عام املاء سے مختلف لکھے گئے ہیں اور قراءت و کتابت دونوں میں اس کی پابندی لازم سمجھی جاتی ہے۔

علم قراءات میں قرآن کو پڑھنے کے ان مختلف متواتر طریقوں کی بحث ہوتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ سات مشہور قراءتوں کو ابن مجاہد نے منتخب کیا اور دس قراءتیں ابن جزری کی النشر سے معروف ہوئیں۔ قراءتوں کا اختلاف رحمت ہے کیونکہ اس سے معانی کی وسعت پیدا ہوتی ہے؛ ہر قراءت گویا ایک الگ آیت کی طرح شاہد ہوتی ہے۔ پاکستان و برصغیر میں رواج پانے والی قراءت، روایت حفص عن عاصم ہے۔ ان علوم کا مقصد متن قرآن کی اصل صورت کی حفاظت اور اس کی صحیح ادائیگی یقینی بنانا ہے۔

علم تفسیر اور اصول تفسیر

تفسیر تمام قرآنی علوم کا مرکز و محور ہے، کیونکہ باقی سب علوم اسی کی خدمت کے لیے ہیں۔ تفسیر کا مطلب ہے قرآن کے معانی و مقاصد کو قواعد لغت و شریعت کے مطابق واضح کرنا۔ تفسیر کی دو بڑی قسمیں ہیں: بالمأثور یعنی قرآن، سنت اور اقوال صحابہ و تابعین کی روشنی میں وضاحت، اور بالرائے یعنی لغت و اصول کی بنیاد پر اجتہادی تشریح جس کی ممدوح صورت علمی اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔ اصول تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں مفسر کے لیے لازم قواعد طے کیے جاتے ہیں؛ ابن تیمیہ کا مقدمہ اور شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر اس فن کی مایہ ناز کتابیں ہیں۔

تفسیر سے منسلک کئی ذیلی علوم ہیں: غریب القرآن یعنی مشکل و نادر الفاظ کی تشریح، اعراب القرآن یعنی الفاظ کے نحوی تجزیے کی بحث، علم الوجوہ والنظائر جس میں ایک لفظ کے مختلف معانی اور مختلف الفاظ کے ایک معنی کی بحث ہوتی ہے، اور علم امثال القرآن جس میں قرآن کی مثالوں کی حکمتیں بیان ہوتی ہیں۔ ان سب کا مقصد یہی ہے کہ مفہوم قرآن تک رسائی دقیق اور درست ہو۔

جدول: چند اہم قرآنی علوم اور ان کے موضوعات

علم	موضوع	نمایاں کتاب
اسباب نزول	آیات کے نزول کے واقعات و پس منظر	اسباب النزول — واحدی
قراءات	قرآن کے متواتر طریقے پڑھنے کی بحث	النشر — ابن جزری
ناسخ و منسوخ	اٹھا لیے گئے اور نئے احکام کی معرفت	الناسخ والمنسوخ — ابو عبید
اعجاز القرآن	قرآن کے معجز ہونے کے پہلو	دلائل الاعجاز — جرجانی
نظم و مناسبات	آیات و سورتوں کا باہمی ربط	نظم الدرر — بقاعی
اصول تفسیر	تفسیر کے قواعد و اصول	مقدمہ فی اصول التفسیر — ابن تیمیہ

ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ

علم ناسخ و منسوخ میں ان آیات کی معرفت حاصل کی جاتی ہے جن کا حکم بعد میں نازل ہونے والی آیت یا سنت سے اٹھا لیا گیا، اور منسوخ ہونے والی آیت کی جگہ نیا حکم آ گیا۔ نسخ کا واقع ہونا قرآن کی تدریجی شریعت سازی کا تقاضا تھا تاکہ امت کو مرحلہ وار احکام کا عادی بنایا جائے؛ قبلے کی

تبدیلی اور شراب کی تدریجی حرمت اس کی روشن مثالیں ہیں۔ اس علم کی اہمیت اتنی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک واعظ سے فرمایا تھا کہ جو ناسخ و منسوخ کو نہیں جانتا وہ خود بھی ہلاک اور دوسروں کو بھی ہلاک کرنے والا ہے۔

محکم و متشابہ کا علم آیات کی درجہ بندی سے معلق ہے۔ محکم وہ آیت ہے جس کا مفہوم واضح اور قطعی ہو اور متشابہ وہ جس کی مراد میں اشتباہ ہو یا اس کی حقیقت اللہ کے علم میں ہو، جیسے حروف مقطعات اور صفاتِ باری تعالیٰ کی آیات۔ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 7 میں اسی تقسیم کا ذکر ہے اور ہدایت یہ ہے کہ متشابہ کو محکم کی طرف لوٹایا جائے اور فتنے کی غرض سے اس کے پیچھے پڑنے سے اجتناب کیا جائے۔ اس علم کا فائدہ عقیدے کی سلامتی اور تاویل کے درست حدود کی تعیین ہے۔

عام و خاص، مطلق و مقید اور دیگر اصولی علوم

اصول فقہ سے جڑے ہوئے قرآنی علوم میں عام و خاص کا علم اہم ہے: عام وہ لفظ ہے جو اپنے تمام افراد کو شامل ہو اور خاص اس کی تخصیص کرنے والا حکم ہے۔ مطلق وہ ہے جو بغیر قید کے آیا ہو اور مقید وہ جو کسی صفت یا شرط کے ساتھ مقید ہو؛ مطلق کو مقید پر محمول کرنا تفسیر و فقہ کا اہم اصول ہے۔ منطوق و مفہوم کا علم بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے کہ نص سے صراحتاً جو ثابت ہو وہ منطوق ہے اور جو اشارتاً سمجھ میں آئے وہ مفہوم ہے، جس کی اقسام میں مفہوم موافقت اور مفہوم مخالفت آتے ہیں۔

ان کے علاوہ علم اقسام القرآن یعنی قرآن کی قسموں کا مطالعہ، علم قصص القرآن جس میں انبیاء و اقوام کے واقعات کی عبرتوں کی بحث ہے، علم جدل القرآن جس میں منکرین سے مناظرے کے اسالیب بیان ہوتے ہیں، علم فضائل القرآن جس میں سورتوں و آیات کی فضیلتیں مذکور ہیں، اور علم اعجاز القرآن جس میں قرآن کے معجز ہونے کے پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے، یہ سب جملہ قرآنی علوم کے درخشاں عنوانات ہیں۔ ان میں سے ہر علم پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور سیوطی نے الاتقان میں انہیں الگ الگ انواع قرار دے کر ہر ایک کی تعریف و مثالیں درج کی ہیں۔

علم اعجاز و نظم اور مناسبات

علم اعجاز القرآن کا موضوع قرآن کا وہ کمال ہے جس کے سامنے انسان و جن عاجز ہیں۔ اعجاز کے پہلوؤں میں فصاحت و بلاغت، غیبی خبریں، علمی اشارات، تشریعی کمال اور اثر و تاثیر شامل ہیں۔ عبد القاہر جرجانی نے اعجاز کی اصل نظم یعنی کلمات کی ترتیب و ترکیب میں رکھی اور دلائل الاعجاز میں اس نظریے کو مدلل کیا۔ اسی نظم سے جڑا علم مناسبات ہے جس میں آیات و سورتوں کے باہمی ربط کی بحث ہوتی ہے۔ برہان الدین بقاعی نے نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور میں پورے قرآن کی مناسبات بیان کیں اور امام رازی کی تفسیر میں بھی یہ پہلو نمایاں ہے۔

عصر جدید میں فراہی و اصلاحی مکتب نے نظم کو تفسیر کی بنیاد بنایا اور ہر سورت کے مرکزی موضوع (عمود) کے گرد آیات کی وحدت ثابت کی۔ یہ علم اس اعتراض کا جواب ہے کہ قرآن کی آیات بے ربط ہیں؛ مناسبات کی معرفت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کا ہر حصہ دوسرے سے گہرا مربوط ہے۔ ان علوم کا جامع فائدہ یہ ہے کہ قرآن کی فنی عظمت دلیل کے ساتھ سامنے آجاتی ہے اور طالب علم محض روایتی انداز کے بجائے فہم و تدبر کے ساتھ قرآن سے جڑتا ہے۔

نتیجہ

حاصل کلام یہ ہے کہ جملہ قرآنی علوم ایک مربوط علمی نظام ہے جس کا ہر شعبہ قرآن کی کسی نہ کسی حیثیت کے لیے وجود میں آیا ہے: کچھ نے اس کے متن و قراءت کو محفوظ کیا، کچھ نے اس کے معانی کو کھولا، اور کچھ نے اس کے اصول فہم کو منظم کیا۔ مکی و مدنی، اسباب نزول، جمع و قراءات، تفسیر و اصول تفسیر، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، عام و خاص، اعجاز و نظم؛ یہ سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں جس کا پھل فہم قرآن ہے۔ طالب علم کو ان میں سے ہر علم کا اجمالی تعارف ضرور معلوم ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے تخصّصی مطالعے کی سمت درست متعین کر سکے۔

سوال نمبر 5 (20 نمبر)

قرآن کے تدریجی نزول اور اس کی حکمتوں پر ایک جامع نوٹ تحریر کریں۔

تعارف

قرآن کریم سابقہ آسمانی کتابوں سے ایک نمایاں وصف میں ممتاز ہے کہ وہ یکبارگی نازل نہیں ہوا بلکہ تیئس برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے اترا۔ اس تدریجی نزول پر کفار مکہ نے اعتراض کیا تھا کہ اگر یہ خدا کی کتاب ہے تو پوری کی پوری ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتر گئی۔ قرآن نے خود اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس تدریج کی حکمتیں بیان کی ہیں۔ اس نوٹ میں پہلے نزول کی دو صورتوں (دفعی و تدریجی) کی وضاحت، پھر تدریجی نزول کی مدت و مراحل، اور آخر میں اس کی اہم حکمتوں کو جامع بیان پیش کیا جاتا ہے۔

ان حکمتوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بھی ہے، صحابہ کی تربیت و تعلیم سے بھی، شریعت کی تدریجی تعمیر سے بھی، اور امت کے مستقبل کی رہنمائی سے بھی۔ اسی لیے یہ موضوع محض تاریخی معلومات نہیں بلکہ اصولِ شریعت اور تربیت کا ایک بنیادی سبق اپنے اندر رکھتا ہے۔

نزول کی دو صورتیں: دفعی اور تدریجی

علماء کے نزدیک نزول قرآن کی دو مرتبے ہیں۔ پہلا نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے بیت العزۃ کی طرف پورے قرآن کا ایک ساتھ اترنا ہے، جو شب قدر میں ہوا۔ اسی کی طرف سورۃ القدر میں اشارہ ہے کہ ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا، اور سورۃ الدخان میں ہے کہ ہم نے

اسے ایک بابرکت رات میں اتارا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی تفسیر منقول ہے کہ قرآن پہلے پورا آسمان دنیا پر اتارا گیا، پھر وہاں سے بتدریج زمین پر اترتا رہا۔

دوسرا نزول وہ ہے جو آسمان دنیا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر تیئس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا۔ پہلی وحی رمضان المبارک میں غار حرا میں سورۃ العلق کی پانچ آیات سے ہوئی اور آخری آیات حجۃ الوداع اور مرض الوفات کے قریب ایام میں نازل ہوئیں۔

نزول کی مقدار بھی مقرر نہ تھی: کبھی ایک آیت، کبھی چند آیات، کبھی پوری سورت نازل ہوتی۔ نزول کے اوقات و مواقع بھی مختلف تھے: دن رات، سفر حضر، گرمی سردی، جنگ و امن، ہر حال میں وحی کا سلسلہ امت کی ضرورت کے مطابق جاری رہا۔

تدریج کی مدت اور مکی و مدنی مراحل

وحی کی کل مدت تیئس برس ہے: تیرہ برس مکہ مکرمہ میں اور دس برس مدینہ منورہ میں۔ مکی دور میں نازل ہونے والا کلام عقائد کی اصلاح پر مرکوز تھا: توحید، رسالت، آخرت، اخلاق کی بنیادیں اور مشرکین کے جوابات اس دور کا موضوع رہے، اور آیات عموماً مختصر مگر پر اثر اور مسجع فاصلوں والی ہیں۔ اس مرحلے میں مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جو ایمان پر ثابت قدم اور قربانی کے لیے تیار تھی۔

مدنی دور میں نماز، روزہ، زکاۃ، حج، جہاد، نکاح و طلاق، میراث، حدود و قصاص اور معاہدات و معاشرت کے احکام نازل ہوئے، کیونکہ اب اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی جسے قانون و نظام کی ضرورت تھی۔ یہ ترتیب خود ایک حکمت ہے: پہلے عقیدہ و اخلاق سے دلوں کو تیار کیا گیا،

پھر ان پر احکام کی عمارت کھڑی کی گئی۔ اگر تمام احکام یکبارگی آجاتے تو ایک جاہلی معاشرہ انہیں برداشت نہ کر سکتا۔ یوں تدریج کا نقشہ خود ایک تربیتی پروگرام کی صورت رکھتا ہے۔

حکمت اول: تثبیت قلب نبوی اور تعلق بالوحی

تدریجی نزول کی پہلی اور سب سے بڑی حکمت خود قرآن نے بیان فرمائی: اور کافروں نے کہا کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا، ہم نے اسے اس لیے اس طرح رکھا تاکہ اس کے ذریعے آپ کے دل کو مضبوط کریں، اور ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سنایا (سورۃ الفرقان: 32)۔ وحی کا بار بار آنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی و تقویت کا سبب تھا؛ ہر مشکل مرحلے پر تازہ وحی آتی، گزشتہ انبیاء کے قصے سنائے جاتے، وعدے کیے جاتے اور دشمنوں کے جواب دیے جاتے۔ واقعہ افک، غزوہ احد کی آزمائش اور طائف کے صدمے کے موقع پر نزول وحی نے دل کو سنبھالا دیا۔

اس کے علاوہ وحی کے تسلسل نے اس بات کو بھی ثابت کیا کہ یہ کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا نہیں، ورنہ وہ اپنے حالات کے مطابق جب چاہتے مرتب کر لیتے۔ کبھی صحابہ کے سوال پر وحی آئی، کبھی کسی واقعے نے نزول کا تقاضا کیا، اور کبھی خلاف توقع آیات اتریں جن میں آپ کی اجتہادی رائے کی تصحیح کی گئی۔ یہ سب تدریج کی برکتیں ہیں جو دفعی نزول کی صورت میں حاصل نہ ہوتیں۔

حکمت دوم: حفظ، فہم اور تعلیم میں آسانی

دوسری حکمت تعلیم و حفظ کی سہولت ہے۔ سورۃ الاسراء میں ارشاد ہے کہ ہم نے قرآن کو جدا جدا کیا تاکہ آپ اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سنائیں، اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا (سورۃ الاسراء: 106)۔ عرب قوم امی تھی؛ لکھنے پڑھنے کا رواج محدود تھا اور حافظہ ہی علم کی منتقلی کا ذریعہ تھا۔ تھوڑا تھوڑا قرآن اترنے سے صحابہ اسے یاد بھی کر لیتے، سمجھ بھی لیتے اور اس پر عمل بھی کرنے لگتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھتے تو آگے نہ بڑھتے جب تک ان کا علم و عمل حاصل نہ کر لیتے۔

یہ تعلیمی اصول آج بھی دنیا بھر میں رائج ہے کہ نصاب درجہ بدرجہ دیا جائے تو علم پختہ ہوتا ہے۔ اگر تینتیس ہزار سے زائد الفاظ و احکام پر مشتمل یہ کتاب ایک دن میں آ جاتی تو اس کا حفظ و فہم اور نسلوں تک منتقلی ناممکن حد تک مشکل ہو جاتی۔ تدریجی نزول نے قرآن کو ایک زندہ نصاب بنا دیا جس کا ہر سبق امت نے عمل کے ساتھ سیکھا، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن اس امت کے سینوں میں آج بھی اسی طرح محفوظ ہے۔

حکمت سوم: تدریج فی التشریع

تیسری عظیم حکمت شریعت کی تدریجی تعمیر ہے، یعنی احکام کو مرحلہ وار نافذ کرنا تاکہ انسانی نفوس انہیں قبول کرنے کے قابل ہو جائیں۔ سب سے مشہور مثال شراب کی حرمت ہے: پہلے اس کے نقصان اور فائدے کا تقابلی ذکر آیا کہ اس کا گناہ فائدے سے بڑا ہے (سورۃ

البقرۃ: 219)، پھر نشے کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے روکا گیا (سورۃ النساء: 43)، اور آخر میں اسے مکمل طور پر شیطانی عمل قرار دے کر حرام کر دیا گیا (سورۃ المائدۃ: 90)۔ اسی مرحلے بندی نے اس بری عادت کو جڑ سے اکھاڑ دیا جو تدریجی تدبیر کے بغیر ممکن نہ تھا۔

اسی طرح سود، نماز کی رکعات، روزے اور جہاد کے احکام میں بھی تدریج نظر آتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشہور روایت اسی اصول کی گواہی دیتی ہے کہ اگر ابتدا ہی میں شراب و زنا کی حرمت نازل ہو جاتیں تو لوگ کہتے کہ ہم تو کبھی نہ چھوڑیں گے؛ پہلے ایمان و آخرت کی سورتیں اتریں، جب دل ایمان میں رچ بس گئے تو حلال و حرام کے احکام بآسانی قبول کر لیے گئے۔ یہ حکمت آج بھی اصلاح معاشرہ اور تربیت میں راہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔

حکمت چہارم: واقعات کے تناظر میں رہنمائی و دیگر فوائد

چوتھی حکمت یہ ہے کہ قرآن زندگی کے واقعات کے ساتھ قدم بقدم رہنمائی فراہم کرتا رہا۔ یہودیوں و منافقین کے سوالات کے جوابات، غزوات کے موقع پر ہدایات، صحابہ کے باہمی مسائل کے حل، حتیٰ کہ گھریلو نوعیت کے واقعات تک میں وحی نے فوری رہنمائی دی، جس سے شریعت محض نظری کتاب نہ رہی بلکہ زندہ قانون بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ و سیرت کی کتابیں واقعات و اسباب نزول کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں، اور آیات کا مفہوم ان کے پس منظر سے اجاگر ہوتا رہا۔

مزید حکمتیں بھی علماء نے بیان کی ہیں: ایک یہ کہ اعجاز کا چیلنج بار بار تازہ ہوتا رہا کہ دشمن ہر نئی تلاوت پر عاجز آتے رہے؛ دوسری یہ کہ نسخ کی منزل بھی تدریج ہی کی دین ہے جس سے احکام کی انتہائی صورت آہستہ آہستہ سامنے آئی؛ تیسری یہ کہ امت کا وحی سے جذباتی و روحانی تعلق تیئس سال تک قائم رہا اور ہر نسل نے تازہ نزول کی لذت پائی۔ ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ تدریجی نزول محض اتفاق نہیں بلکہ الٰہی حکمت کا شاہکار ہے۔

نتیجہ

خلاصہ بحث یہ ہے کہ قرآن کا تدریجی نزول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کی تثبیت، امت کے حفظ و فہم کی آسانی، شریعت کی مرحلہ وار تعمیر، واقعات کے تناظر میں عملی رہنمائی اور اعجاز کے مسلسل اظہار جیسی عظیم حکمتوں پر مشتمل تھا۔ خود قرآن نے کافروں کے اعتراض کا جواب دے کر ان حکمتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ طالب علم جب اس پس منظر میں قرآن پڑھتا ہے تو اسے یہ کتاب ایک زندہ اور ہمیشہ راہنما کلام کے روپ میں نظر آتی ہے، اور یہی تدریجی نزول کی معرفت کا اصل ثمر ہے۔